ڈاکٹر محمد عارف خان

زوال امت کا مداوا

سیرت محمد ﷺ کا دعویٰ

مطالعہ سیرت میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا انداز فکر

تعارف

اس موضوع پر گفت گو کرتے ہوئے پہلی بات جو ہمارے مدنظر ضروری ہے کہ ہم عنوان بالا کی توضیح وتشریح پندرہویں صدی ہجری/ اکیسویں صدی عیسوی (۱) میں کریں گے کہ زوال امت کیا ہے؟ ہے بھی نہیں؟ امت کو اگر یہ اندازہ ہے کہ ہم زوال کا شکار ہیں تو سوال پیدا ہوگا کہ زوال امت کا مداوا اب کیسے ممکن ہے۔ مداوا وابستہ ہے اس بات سے کہ امت کی زوال سے نکلنے کے لیے آرزو کتنی شدید ہے؟ وہ غایت کیا ہے کہ ہمیں زوال سے نکلنا ہر حال میں لازم ہے؟ غایت باقی رہنا اور آگے بڑھنا ہے۔ سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور علم بالوحی میں حصول غایت کا دعویٰ ہی ہمارا مداوا ہے۔ وہ دعویٰ کیا ہے؟ یہ جائزہ خصوصی طور پر ہم ڈاکٹر برہان

۱۔ سن ہجری ۱۴۴۲ء ہے اور سن عیسوی ۲۰۲۰ء ہے۔ گویا سن ہجری پندرواں جاری ہے۔ زوال اور شناخت کے گم ہونے کی وجہ میں کئی دوسری وجوہات کے علاوہ یہ بھی اہم وجہ ہے۔ غالب دنیا مسیحیت سے متعلق ہے۔ اس لیے قریب قریب ساری دنیا میں عیسوی سال مروج ہے۔ روزمرہ معاملات میں یہی فروغ ہے اور ہمارا نظام تعلیم بھی اپنی روایت کو ڈھونڈنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اگر امت کو زوال سے عروج کی طرف جانا ہے تو اپنی روایتی اور شناخت کی بنیاد پر ہی آگے جانا ہے۔ اس مقابلے میں پندرویں/ اکیسویں سے مراد دونوں سن ہجری اور سن عیسوی مراد ہیں۔

احمد فاروقی (۱) کے زاویہ نگاہ اور انداز فکر کے تحت لیں گے جب کہ مستعار تاثر سے علوم سیرہ کی نشان دہی اس آرزو کے تحت کریں گے، کہ اپنی روایت کی تقلیدی روش کو تخلیقی روش پر لانا ضروری ہوگیا ہے۔اس کے بغیر نہ وہ ماضی کی قید سے باہر آسکیں گے، اور نہ اس علمی، فکری اور عسکری گھیرے کو توڑ سکیں گے جس نے زوال و تقلید کا خوگر کر رکھا ہے۔امت کو جہاں علمی و فکری سطح پر مقابلے کے لیے علم بالوجی اور سیرت طیبہ مسلم سے ماخوذ نئی تخلیقی فکر کی ضرورت ہے، وہاں ایک ولولہ انگیز قیادت کا تاثر درکار ہے۔ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ ممکن نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے ہمیں علوم سیرہ (۲) کے لیے جدید وقت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ضابطوں کا تعین کرنا ہوگا۔ خلاصہ بحث میں مقالے کا اختتام ہوگا۔

❋

۱۔ ڈاکٹر برہان احمد فاروقی بہ حوالہ منہاج القرآن ۱۹۰۶ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۹۵ء میں لاہور میں انتقال ہوا۔ تعلیم ملتان، لاہور اور پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ خصوصی تربیت ڈاکٹر سید ظفر الحسن سے پائی جو اس وقت علی گڑھ میں شبہ فلسفے کے استاد تھے۔ علامہ اقبال کی تجویز اور سید ظفر الحسن کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ مقالہ حضرت مجدد الف ثانی کے نظریہ توحید پر تھا۔ ۱۹۴۰ء میں یہ مقالہ شائع ہوگیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، زمیندارہ کالج گجرات، اسلامیہ کالج جالندھر، ایم۔اے او کالج لاہور، اسلامیہ کالج اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات سے منسلک رہے۔ راقم الحروف ۱۹۷۵۔۱۹۷۷ء نے پنجاب یونیورسٹی میں کسب فیض حاصل کیا۔ فقیر نفس بندے تھے۔ لکھتے بھی تھے مگر باقاعدہ تصانیف کی طرف توجہ نہیں کی۔ ''منہاج القرآن'' اور ''قرآن اور اس کے زندہ مسائل'' ادارہ ثقافت سے شائع ہوتی ہیں۔ فلسفہ اسلام کے علاوہ کئی مضامین شائع شدہ ہیں۔ راقم الحروف نے بھی اپنے کلاس نوٹ اور چند مضامین کی اشاعت کو ممکن بنانے کی کوشش میں ہے۔

۲۔ سید عزیز الرحمن ناظم دعویٰ اکیڈمی کراچی، زوار اکیڈمی کراچی کے تحت ''دارالعلم والتحقیق'' میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر گراں قدر تحقیقی کام کر رہے ہیں خصوصاً ''علوم سیرت'' پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ ''منہاج القرآن'' کی شرح کرنے کے دوران انہوں نے ''علوم سیرت'' کی طرف توجہ دلائی۔ اس مقالے کی دوسرے حصے میں ڈاکٹر فاروقی کے تاثر کے ساتھ ''علوم سیرت'' پر گفت گو کی ہے۔

پندرہویں صدی ہجری (۱۴۴۲ھ) اور اکیسوی صدی عیسوی (۲۰۱۹ء) کی حاضر و موجود دنیا میں ہم ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کے آرزومند ہیں جن کا تعلق ہمارے زوال، محکومی، افلاس اور جمود سے ہے۔ حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ امت ابھی باقی ہے اور بہ قول اقبال امت تیری دیوانی ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دیوانگی اور وفا اور قرآن پر یقین ہمارے باقی رہنے کے اسباب ہیں۔ ان ہی دو اسباب کی بنا پر وہ دوبارہ عروج کی راہ پا سکتے ہیں۔ عروج و زوال قوموں کی فطرت کا حصہ ہے۔ امت کا زوال فطرتِ الٰہی کا حصہ قرار دیا جا سکتا ہے مگر طوالت کو فطرت الٰہی کا حصہ قرار دینا حقائق سے فرار ہے۔ حقائق سے فرار ہی دراصل امت کے جاری زوال کی طوالت کا باعث ہے۔ طوالت میں ہماری غلطیاں ہیں اور یہ ذمے داری دوسرے کسی پر ڈالنا ناانصافی ہوگی۔ لمحہ موجود میں قائم معیارات و بے مانے پر ثابت کرتے ہیں کہ مسلم دنیا تیسری دنیا کے درجے میں ہے، او آئی سی نے کردار ادا کیا ہے، وہ ہمارے غیر معیاری ہونے کی تائید ہے۔ امت کو اس سے نکلنا ہے اور نکلنے کے لیے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہم زوال کا شکار ہیں۔ اپنی موجودہ حالت کو تسلیم کرنا ضروری شرط ہے۔ یہ تسلیم کرنے کے لیے عروج و زوال کے کائناتی قانون کو سمجھنا ضروری ہے۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی قانونِ عروج و زوال کو اس ذیل میں زیر بحث لاتے ہیں اور قرآن حکیم میں سابقہ انبیا اور امتوں کے عروج و زوال کے بیان سے تاریخی حرکت کے کائناتی قانون کی نشان دہی کرتے ہیں:

۱۔ تاریخی حرکت ہے کیا؟ اور لمحہ موجود تک انسانی دانش نے اس سے کیا مطلب لیا ہے؟

۲۔ تاریخ، ماضی قریب و بعید کے واقعات و حادثات کا بیان ہے۔

۳۔ تاریخ، قوموں و تہذیبوں کے عروج و زوال کی۔ توجیہ کا علم ہے۔

۴۔ تاریخی حرکت میں نہ عروج ہے اور نہ زوال ہے۔ یہ میکانیکی توجیہ ہے۔

۵۔ تاریخی حرکت انسانیت کو اس کے زوال کی طرف لے جا رہی ہے۔ یہ مسیحی علم الکلام کی توجیہ ہے۔

۶۔ تاریخی حرکت انسان کو عروج کی طرف لے جا رہی ہے۔ یہ حیاتیات میں ارتقا کا قانون ہے۔

۷۔ تاریخی حرکت تصورات کی جدلیت، اثبات، نفی اور تطبیق ہے۔ یہ ہیگل کا نظریۂ تاریخ ہے۔

۸۔ تاریخی حرکت معاشی طبقات کی جدلیت وکش مکش سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ مارکس کا تصور ہے۔

۹۔ تاریخی حرکت تخلیق اقوام وتجدید ملل کا عمل ہے۔ یہ قرآن کا تصور تاریخ ہے۔ اسی کو ڈاکٹر فاروقی ''قانون تضاد'' کہتے ہیں۔(۱)

دوم: قانون تضاد کو قانون نشوونما بھی کہا گیا ہے۔ قرآن حکیم کی دو آیات سے اس کی نشان دہی مطلوب ہے:

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۝ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ، وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ، وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ ۝ (۲)

اور اگر آپ کا رب چاہتا تو ضرور کر دیتا سب لوگوں کو ایک امت۔ وہ ہمیشہ اختلاف ہی کرتے رہیں گے مگر وہ جن پر رحم کیا تیرے رب نے اور اسی لیے پیدا کیا ہے ان کو اور پوری ہوئی تیرے رب کی بات، البتہ بھروں گا میں دوزخ کو سب جن اور آدمیوں سے''(۳)

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ، وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ۝ (۴)

اور اس طرح ہم نے بنا دیا ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے ایک شخص اور کافی ہے

۱۔ مقالہ زیر نظر میں بنیادی مآخذ ''منہاج القرآن'' ہی ہے جس میں سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور علوم سیرۃ پر بنیادی اصول انہوں نے مرتب کیے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری کتب، مضامین مدنظر رہے ہیں۔ ص ۲۵۷ پر قانون تضاد سے بحث کی ہے۔

۲۔ ھود: ۱۱۸۔۱۱۹

۳۔ منہاج القرآن: ص ۲۶۸

۴۔ الفرقان: ۳۱

آپ کا رب ہدایت کرنے والا مددگار۔(۱)

خدا نے انسانوں کو اپنی مشیت سے ایک امت یا قوم نہیں بنایا اور فطری تضاد سبب بتایا حال آں کہ خدا کو قدرت حاصل تھی۔ دوسرا نبی بھیجا تو مجرموں میں سے دشمنوں کا گروہ پیدا کر دیا۔ مزاحمت و کش مکش کی یہ کہانی ہی تاریخی قانون تضاد ہے۔ اقوام بنتی ہیں، مزاحمت سے مٹتی بھی ہیں اور زوال پذیر بھی ہوتی ہیں۔ زوال پذیر قوموں کو تجدید کی حوصلہ افزائی قرآن کرتا ہے۔(۲)

سوم: ڈاکٹر فاروقی نے زوال کی بنیادی وجہ ''معاشی تعطل'' قرار دیا ہے، البتہ قومی و تہذیبی زوال میں سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی اسباب کی نشان دہی بھی ہے جو یہ کہ کسی فرد اور گروہ کی زندگی سے معاشی تعطل یعنی تخلیقی جدوجہد میں رکاوٹ کی ذمے داری کوئی قبول نہ کرنا ہو۔ یہ ریاستی ذمے داری ہے۔ دوسری طرف معاشی تخلیق کی جدوجہد کرنے والے افراد یا گروہ ایک دوسرے کی ضرورت یا ہم دردی کرنے کے خیال سے بے نیاز ہو جائیں۔ یہ تمدنی و اخلاقی زوال ہے۔ قومی غایت کا تصور ناپید ہو جائے، قیادت اجارہ دار بن جائے، عمرانی ادارے بدنظمی کا شکار ہو جائیں۔ قومی مفاد پر ذاتی مفاد غالب آ جائے، یوں غیر عادلانہ معیشت قائم ہوتی، جو زوال کی راہ پر ڈال دیتی ہے۔ ان کے الفاظ میں:

فرعونی مفاد غالب آنے لگے، قانون کے غلبے کے بہ جائے حاکم کا غلبہ مقصود بن بیٹھے جائے تو ''عزیمت'' کے بہ جائے ''رخصت'' پر عمل کرنا شعار بن جاتا ہے۔(۳)

چہارم: ایمانی، فکری اور اخلاقی پہلوؤں کی معنویت بدل گئی:

۱۔ عقائد اور عبادات بے جان ہو کر اپنی حقیقت کھو بیٹھے اور محض رسوم و ظواہر کی نمائشی صورت باقی رہ گئی۔

۲۔ ہر فرقہ پرست گروہ نے اپنی فرعونی فرقہ پرستانہ آرزوؤں کو پیغمبرانہ راہ حق پرستی سمجھا۔

۱۔ ایضاً: ص ۲۶۷

۲۔ ایضاً: ص ۲۶۲

۳۔ ایضاً: ۲۷۹

۳۔ باطنی طمانیت کی خاطر معاشی دوڑ سے الگ ہو کر راہبانہ اور افلاس کی زندگی کو ترجیح دینا۔

۴۔ کفر کا فتویٰ ایک زندہ، طاقت ور نظام معاشرے سے الگ کرنے کے بہ طور ایک سزا کی حیثیت تھا۔ فرقہ واریت میں اختلاف کے اظہار کا ذریعہ بن گیا ہے۔

۵۔ قانون ریاست واقتدار کے ذریعے روبہ عمل ہوتا ہے۔ دور اقتدار میں علما یہی کرتے رہے۔ اقتدار سے محروم ہو جانے کے بعد علما نے آزادانہ وجابرانہ قانون سازی کو اپنا حق باور کرنا شروع کر دیا۔

۶۔ غایت کا شعور مٹ گیا، نظام افکار کی روح فنا ہو گئی تو تنظیم معاشرت وتمدن بکھر گئی۔ (۱)

پنجم: امت کے زوال میں کارفرما عوامل واسباب کی اصولی تعبیر کی گئی ہے۔ ڈاکٹر فاروقی نے قرآنی دتاریخی وجوہات کی ضابطہ بندی کرتے ہوئے زوال کے اسباب کا تعین کیا ہے اور اگر ہم اس بات کو ایک فرد یا ایک کی نسبت سے بیان کرنا چاہیں تو ایک جملے میں یوں کیا جا سکتا ہے:

ہمارا زوال ہماری سیرت میں زوال کا نتیجہ ہے۔

المیہ ہے کہ اس المیہ کو ہوئے مدت گزر گئی مگر ہم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ زوال کی وجہ ہماری سیرت وکردار ہے۔ دعویٰ ہمارا سیرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے کہ وہ نمونہ کمال ہیں۔ عمل ہمارا قطعی مختلف ہے۔ غلط فہمی یہ ہو گئی کہ مسلمان ہونا اور امتی ہونا کافی ہے۔ بے عملی کی سزا اگلے جہاں میں ممکن ہے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ پیغام نبوت اور علم بالوحی دنیا کے تمام انسانوں اور قوموں کے لیے ہے۔ اسلام کی سربلندی انسانوں سے وابستہ ہے مگر امت کی سربلندی صرف اسلام سے وابستہ ہے اور اس کا میدان یہ ہے۔ دوسری طرف قوموں نے سیرت میں پختگی دکھائی اور عروج حاصل کر لیا۔ اپنے روایتی اسلوب میں ان ''تقویٰ شکن'' قوتوں کا حال سیرت بیان کرتے ہوئے بکتے ہیں:

''بہ خلاف اس کے تقویٰ شکن قومیں زندہ مشاہراتی علوم کے (جو تسخیر ماحول میں مؤثر ہیں) حاصل کرنے، مقصد کے حوالے سے سیرت وکردار پیدا کرنے، کائناتی ادراک کو نمایاں کرنے کی آرزو کے تحت مقصد کے شعور کے ساتھ منصوبہ بندی، مسابقت اور کش مکش میں

۱۔ ایضاً: ص ۱۹

پڑنے، تصادم کے لیے آمادہ رہنے، حقیقت پرستی اور ماحول کو سازگار بنانے کے کوشاں رہنے کی بنا پر عملی زندگی کو قانون پروردگاری سے سازگار بناتی چلی گئیں۔''(۱)

امت کی نسبت سے زوال ایک امر واقع ہے اور عروج کو دوبارہ امر واقع بنانا ہے، مگر کہتے؟ ڈاکٹر فاروق نے بڑی بصیرت افرز بحث اٹھائی ہے کہ غایت ہماری اگر زوال سے نکلنا اور عروج کو پانا ہے تو سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور علم بالوحی کا دعویٰ ہی ہمارا مداوا ہے جس میں تجدید ملل کا یقین دلایا گیا ہے۔ لکھتے ہیں:

ا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر انقلاب ہیں۔

ب۔ جن کی آرزوئے انقلاب مقدم ہے اور نزول قرآن مؤخر ہے۔

ج۔ اور قرآن صحیفۂ انقلاب ہے۔(۲)

زوال سے عروج کا سفر ایک مکمل تبدیلی کی آرزو ہے۔ اسے انقلاب سے تعبیر کریں تو اس کے رہبر انقلاب تب بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اب بھی وہی ہوں گے۔ یہ طے کیے بغیر محض صحیفۂ انقلاب مؤثر نہیں تھا اور جس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ سیرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک طاقت ور جوہر قرار دیے بغیر عروج کی منصوبہ بندی ممکن نہیں ہے۔ عروج کا لائحہ عمل دور رسالت سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> دور رسالت مقصود بعثت کے حصول کی جدوجہد کے اتمام کو پہنچنے کا دور ہے اور دور مابعد رسالت ان اقدار حیات کی حفاظت کے لیے جدوجہد کا دور ہے جو دور رسالت میں قائم ہوگئی تھیں اور اگر وہ اقدار حیات امت کے زوال پذیر ہونے کی بنا پر مٹ جائیں تو دور مابعد رسالت میں انہیں دوبارہ حاصل کرنے کی جدوجہد ضروری ہے۔(۳)

اسلام کی تاریخ کے دو واضح حصے ہیں۔ دور رسالت اور دور مابعد رسالت۔ ڈاکٹر فاروقی

۱۔ ایضاً: ص ۲۰

۲۔ ایضاً: ص ۲۸۶

۳۔ ایضاً: ص ۳۹

نے پندرہویں سے اکیسوی صدی تک کو سات ادوار میں تقسیم کیا ہے۔(۱) دور رسالت کو تین حصوں میں زیر بحث لائے ہیں اور اس ارتقاو تدریج کو عیاں کرنے کی کوشش کی ہے جو تحریک کا لازمہ ہے اور یہی لازمہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فریضہ نبوت کا حصہ ہے۔

۱۔ظہور نبوت سے ہجرت تک کا مکی دور۔(نظریاتی دور)

بنیادی طور پر یہ ایمانی ونظریاتی دور ہے۔ بعثت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت کا اعلان ہوا۔ تمدن مکہ و بعد ازاں عرب میں اصلاحی احوال کے حوالے سے نئی دعوت کا پیغام واضح کیا گیا۔ یہ بھی بتا دیا گیا کہ اصلاح احوال کے جاری مقصد کے لیے یہ پیغمبرانہ نظام کی آخری کڑی ہے۔ نزول وحی کے تحت ہدایت کو سامنے رکھا گیا۔ خدا کی حقیقت کو نبوی سے امتیاز دیا گیا۔ شخصیت سازی کو ''النسان مرتضیٰ'' کے نصب العین سے جوڑ دیا گیا۔ پیغمبر انقلاب نے انقلاب کے نظریاتی پہلوؤں کی ضرورت کو اجاگر کیا۔ تمدن سے ایک فطری ردعمل آیا۔ قانون تضاد حرکت میں آیا۔ کش مکش نے جنم لی۔ تصادم برپا ہونے لگا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دور میں دعوت پر توجہ مرکوز کی اور وحی کے پیغام کو سامنے رکھا:

اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۱۹﴾ (۲)

یہ تذکرہ (نصیحت) ہے جو چاہے اپنے رب کی طرف راستہ اختیار کرے۔(۳)

ڈاکٹر فاروقی کے نزدیک یہ دور انفرادی زندگی کے ذہنی، ایمانی اور اخلاقی پہلوؤں کی اصلاح پر مشتمل ہے۔(۴)

۲۔ہجرت سے فتح مکہ تک دور۔(حکمت عملی کا دور)

معاشرتی، معاشی اور سیاسی پہلوؤں کی نشوونما کا یہ دور حکمت عملی کا دور شمار ہوتا ہے۔

۱۔ایضاً: ص ۳۱

۲۔المزمل: ۱۹

۳۔ایضاً: ص ۳۲

۴۔ایضاً: ص ۳۲

اجتماعی تنظیم کو اصولوں کی بنیاد پر منظم کیا گیا۔ مثالی معاشرے کے لیے اخوّت، معاشی پہلو سے حرص و بخل کی جگہ ایثار و اتفاق اور سیاسی پہلو میں ''کلمہ طیبہ'' کو عمرانی وحدت کی بنیادیں فراہم کی گئیں۔ لیکن کلمہ طیبہ کے نظری پہلو کا تعلق مسلمانوں کے تصورات اجتماعیت کی طرف ہے جب کہ عملی طور پر ''کلمہ طیبہ'' کا معنیٰ ''وحدت انسانی'' لیا گیا اور ''میثاق مدینہ'' جو بہ طور ''معاہدہ عمرانہ'' متعارف کرایا گیا، تمام انسانوں بمع ہر مذہب، قبیلہ، رنگ و نسل کا نمائندہ تھا۔ اس دوران مثالی معاشرے کی ایک جھلک ڈاکٹر فاروقی کے الفاظ میں یوں سامنے آتی ہے:

۱۔ ایک مثالی معاشرے کے قیام کے لیے نصب العین کا تعین ہو گیا۔

۲۔ نوع انسانی کی وحدت کے تصور پر مبنی نصب العین کے لیے جدوجہد کو منظم کر دیا گیا۔

۳۔ اخلاقی جدوجہد اور روحانی الذین افراد کو تیار کرنے کا عمل شروع ہوا۔

۴۔ معاشرے کے استحکام کی اساس محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی غیر مشروط اطاعت اور وفاداری قرار پائی۔

۵۔ جدوجہد کا رخ اور نتیجہ ''خوف و غم'' سے پاک تمدن قرار پایا۔

یوں تھوڑی مدت میں اخلاقی لحاظ سے صحت مند معاشرہ، تخلیقی جدوجہد کے تعطل کو رفع کر کے عادلانہ معاشی نظام کا قیام اور سیاسی اعتبار سے وحدت انسانی کے احترام پر معاہدۂ عمرانی کو وجود میں لا کر سیاسی تضاد کو رفع کرنے میں کامیابی حاصل کی اور وہ مطلوبہ طاقت پالی جو باقی رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے ضروری تھی۔(۱)

ج۔ فتح مکہ سے حجۃ الوداع تک: (عملی اور نتیجہ خیزی کا دور)

''دین الحق'' لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۲) غلبہ دین کا نصب العین اور اس کے حصول کے لیے لائحہ عمل اور اس پر عمل پیرا ہونے کی منصوبہ بندی کا دور کہلاتا ہے۔ پیغمبرانہ نظام کی یہ آخری خدائی ہدایت نزول وحی کا تدریجی راستہ اختیار کرتی ہے۔ پیغمبرانہ قیامت اپنا فریضہ نبھاتی ہے۔ باقی رہنے اور آگے بڑھنے کا یہ اصولی راستہ ہے۔ عمل ہوتا ہے تو ایک ردعمل

۱۔ ایضاً: ص ۳۴

۲۔ توبہ: ۳۳

آتا ہے۔ ڈاکٹر فاروقی کے مطابق قران ردعمل میں تین فریقوں کا تعین کرتا ہے۔

۱۔ مومن، جس کی دل نوازی ضروری اور معاشی لحاظ سے مستحکم تاکہ تصادم کے لیے تیار ہو سکے۔

۲۔ کافر، طاقت سے زیر کرتے، غلبہ دین حق قائم کر کے یہ باور کرانا کہ دین اسلام انسانیت کی فلاح کی آخری خدائی ہدایت ہے۔

۳۔ منافقوں کی پردہ دری اس وقت تک کرنا جب وہ کافروں یا مسلمانوں سے جاملیں۔(۱)

تاریخ انسانی میں نبوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دو حوالوں سے سنگ میل ہے۔

اول: نظام نبوت کو ماضی کر دیا

دوم: نظام نبوت کو مستقبل کر دیا۔

محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی نبوت آخری قرار دے کر نظام نبوت موقوف کر دیا گیا۔ یوں ایک ورق تاریخ ماضی ہو گیا۔

نبوت و دین کی تکمیل ہو گئی۔ انسان باشعور ہو گیا۔ وہ سہاروں سے آزاد ہو کر اپنی راہ اپنی بصیرت کی روشنی میں اپنانے کے لیے آزاد ہو گیا۔ یوں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا خاتمہ کیا۔ ارتقائے نبوت کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تکمیل کر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت الٰہی کے مطابق پیغمبرانہ فرائض کو انسانی بصیرت کے حوالے کر دیا۔ یہ دوسرا سنگ میل خطبہ حجۃ الوداع کے فوری بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحلت کے بعد ظہور پزیر ہو جاتا ہے۔ اس کا آغاز ''خلافت راشدہ'' کے دور سے شروع ہو جاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر فاروقی ''انسانی استعداد'' مستقبل کے لیے ''مستقل'' ہو جاتی ہے۔ انسان نے جو امت کا حصہ بنا، پیغمبرانہ قیادت کے اس سائے سرمایے کو محفوظ کیا اور اپنی بصیرت پر اعتماد کیا۔ یوں ''مستقبل'' کو ''مستقل''، علمی سرمایہ دیا۔ مسلم تاریخ میں ان علوم کا اثر و تسلسل بڑا گہرا ہے:

۱۔ ایضاً: ص ۳۷

۱۔جمع تدوین قرآن اور اس کے مطالعہ کے لیے اصول وآداب (علوم القرآن)
۲۔جمع احادیث اور اصول احادیث
۳۔تخلیق وتدوین قانون (فقہ اور اس کے ضوابط)(۱)
۴۔عقلی علوم، جو اثبات، نفی اور تطبیق کی جدلیت سے گزرتے لحہ حال تک برقرار ہیں(۲)
۵۔سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یا علوم سیرۃ(۳)
یہ ایسے علوم ہیں جو دور عروج کا باعث بنے۔ پھر ان ہی علوم کی موجودگی میں امت

۱۔ان عنوانات پر کتب کا شمار نہیں ہے۔شبلی نعمانی کی ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم''، راغب الطباخ (ترجمہ۔افتخار احمد بلخی) تاریخ افکار وعلوم اسلامی، ادارہ معارف اسلامی کراچی اور اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور (دو جلدیں) اور ڈاکٹر محمود احمد غازی کی محاضرات قرآنی، محاضرات حدیث اور محاضرات فقہ دیکھی جاسکتی ہیں۔

۲۔ یہ مباحث ''منہاج القرآن'' ص ۶۵، قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ص ۴۵ موجود ہیں۔اس کے علاوہ علامہ اقبال کی ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' اور اس کی تشریحی صورت راقم الحروف کی ''مباحث خطبات اقبال'' (بک کارنر جہلم) اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی ''قرآن وعلوم جدید'' اور اس کی توضیحی صورت راقم الحروف کی ''مطالعہ قرآن کی نئی جہتیں (ادارہ ثقافت، اسلامیہ لاہور) ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

اردو میں قاضی قیصر الاسلام ''فلسفہ کے بنیادی مسائل'' آسان فہم تحریر ہے جب کہ علی عباس جلال پوری کی ''روایت فلسفہ'' اس موضوع پر عمدہ کتاب ہے۔یہ خالصتاً عقلی علوم کی توضیح ہے۔اردو تراجم میں متعدد کتب ہیں مگر کانٹ کی ''تنقید عقل محض'' ترجمہ سید عابد حسین اور ''فلسفہ مغرب کی تاریخ'' جو برٹنڈرسل کی معروف کتاب ہے۔کچھ عرصہ قبل پروفیسر محمد شبیر نے اس کا ترجمہ کیا ہے۔دانش اور انسان میں بھی راقم الحروف نے یہ بحث اٹھائی ہے۔

۳۔شبلی نعمانی کی ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' اس حوالے سے جدید اور اعلیٰ پائے کی کوشش ہے۔ ''علوم القرآن'' کے ضمن میں شاہ ولی اللہ نے ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ عالم اسلام میں ایک جدید انقلابی جہت دی تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کو جدید علوم کے تاثر کے ساتھ نمایاں کرنے میں شبلی نعمانی کامیاب ہوئے۔علوم القرآن اور علوم سیرۃ کو وقت سے مناسبت دینے میں علامہ اقبال سرفہرست آتے ہیں۔ڈاکٹر محمود احمد غازی کی ''محاضرات سیرت'' تازہ کوشش ہے۔

عروج سے زوال آمادہ ہوئی۔ مسلم قوت کسی نہ کسی صورت میں باقی تو رہی ہے۔ ۱۲۵۸ء میں سقوط بغداد کے بعد بھی کہیں نہ کہیں باقی ہونے کی جدوجہد اور قوت ابھرتی رہی مگر امت اجتماعی طور پر دوبارہ پنی صفوں کو درست نہ کرسکی، آخری کوشش کے طور پر عثمانی ترکوں کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ:

۱۔ وہ علوم، جو عروج کا باعث بنے، ان کی موجودگی میں زوال کیوں ہوا؟

۲۔ آیا یہ علوم قدیمی و ماضی ہوگئے یا ان کے اثرات باقی نہ رہے تھے؟

۳۔ کیا ان علوم کی بنیادی پر ہم دوبارہ عروج کی آس لگا سکتے ہیں؟

ان سوالات کے بے باک تجزیے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر فاروقی نے تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ پہلے سوال کا جواب چند سطور قبل آچکا ہے یعنی غایت کے خیرہ ہوجانے کے بعد تمدنی ماحول پر مزعومہ مفادات کے غالب آجانے کی وجہ سے مفاد پرستانہ غریب میں مبتلا ہوگیا؟ اور طاقت کم زور ہوگئی۔ (۱) دوسرے سوال کے مطابق علوم کی دو قسمیں تھیں:

اول، پیغمبر انقلاب کی سیرت مطہرہ و قرآن حکیم

دوم، تفسیر و علوم فقہ دوسرا اخذ علم

قسم دوم میں مذکور علوم بوجوہ غیر مؤثر ہونے لگے۔ قسم اول میں مذکور علوم نہ کل قدیمی و ماضی ہوئے اور نہ گزشتہ چودہ برسوں میں ہوئے، نہ پندرہویں/ اکیسویں صدی میں ماضی ہوئے ہیں اور نہ غیر مؤثر اور نہ آئندہ ایسا ہوگا۔ علوم کی یہی اصل دوبارہ عروج کی بنیاد بنے گی۔ اول الذکر علوم ایمان، یقین اور نتیجہ کا تقاضا کرتے ہیں۔ عدم مذکور علوم بھی اپنے وقت کی ضرورت کے مطابق انسان اپنی بصیرت و استعداد سے علم کی تنظیم کرتا ہے۔ یہ تنظیم عارضی ہوتی ہے اور کسی وقت بھی غیر مؤثر ہوسکتی ہے۔ وقت، ماحول اور معاشرہ تیزی سے ترقی کرتا ہے۔ آپ کی علمی تنظیم میں لچک نہیں اور حاکمیہ قانون پر زور ہے تو وقت اور علمی تنظیم میں فاصلے بڑھنے شروع ہوجاتے ہیں۔ بال آخر وقت آگے بڑھ جاتا ہے اور علمی تنظیم پیچھے رہ جاتی ہے۔ امت کے ساتھ یہی ماجرا ہوا ہے۔ امت کو آج بھی التباس ہے اور یہی یقین کا سبب ہی۔ قسم دوم میں مذکور علمی

۱۔ منہاج القرآن: ص ۲۵۸

تنظیم کے حاصل علوم نہ تب ایمان کا تقاضا کرتے تھے اور نہ پندرہویں/اکیسویں صدی میں تقلید کا تقاضا کرتے ہیں۔ قسم اول یعنی سیرت پیغمبر انقلاب اور قرآن یا وحی و صاحب وحی تب بھی ایمان کا تقاضا کرتے تھے اور آج بھی ایسا ہی ہے۔ یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ:

۱۔ امت کے افراد یا اہل ایمان اور اہل دانش کا ایک معتبر و عالی شان مساعی، جدوجہد اور کردار تھا۔ انہوں نے سیرت پیغمبر انقلاب سے سیکھا، علم وحی کو جاننے کی کوشش کی، اس کی علمی تنظیم قائم کی، اطلاق کے لیے لائحہ عمل مرتب کیا اور ایک طاقت ور تہذیب کو جنم دیا۔ فطرت کے قانون عروج و زوال کے عین مطابق کوئی تین سو صدیوں کے بعد ہر شے میں ٹھہراؤ آنے لگا۔ امت کے محرک افراد کا یقین زائل ہونے لگا۔ اصل ماخذ سے نئی علمی تنظیم کی ضرورت تو لاحق ہوگئی مگر لاحق ضرورت پوری نہ کی جاسکی اور تہذیب عرب جو اسلام کے نام پر پروان چڑھی اور اسلام کی شکست کے نام پر یہ تہذیب بھی مٹ گئی۔ سقوط بغداد ۱۲۸۵ء کا واقعہ ہے۔

۲۔ یہاں یہ بھی جاننے کی ضرورت ہے کہ یہ اسلام کی شکست تھی یا امت کی نمائندہ عرب قوتوں و تہذیب کی ہار تھی۔ اسلام کا معنی اگر علم بالوحی اور پیغمبر انقلاب کی نسبت سے ہے تو شکست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ پیغام الٰہی بصورت قرآن و سیرت پیغمبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مناسبت سے برقرار اور جاری ہے اور جب ہم آج پندرہویں/اکیسویں صدی میں عروج کی بات کرتے ہیں تو امت یا مسلمانوں کی بات کرتے ہیں۔ تمام سابقہ پیغمبرانہ نظام اور آخری پیغمبر کا طاقت ور پیغام بدستور موجود ہے۔ علوم مختلف صورتوں میں سما چکا ہے۔ علم کو قرار ہے نہ ٹھہراؤ، قرار اور ٹھہراؤ انسان کی استعداد و چال میں ہے۔ امت کے حصول میں علم میں ٹھہراؤ آیا تو زوال آیا۔ علم میں زوال نہیں بل کہ حیران کن ترقی و نشوونما ہوئی ہے۔ یہ ترقی و نشوونما انسان کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ یہ خدا کی منشا کے خلاف عین مطابق ہوئی ہے۔ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا کی تعبیر ہے۔ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور علم بالوحی کی خوش بو علم کی ہر شاخ میں پائی جاتی ہے۔ وحی کے تحت دونوں نور قرار دیے گئے اور غور کی خوش بو خود رو ہو جاتی ہے۔ (۱)

۱۔ النور: ۳۵

تاریخ انسانی میں وحی قرآن بھی دو حوالوں سے سنگ میل ٹھہری:

اول: وحی قرآن میں آ کر مکمل ہوگئی اور موقوف ہوگئی (۱)

دوم: ختم نبوت کے بعد تجدید ملت کے لیے نئی بعثت سے بے نیاز ہوگئی (۲)

عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظام وحی و نبوت کے تحت تسلسل سے انسانوں کو باور کیا جاتا رہا ہے۔ دوسرا ختم نبوت و وحی کے موقوف ہونے پر انسان اپنی استعداد و بصیرت پر مکمل بھروسہ کر کے آگے بڑھتا رہے گا۔ ہم اسے اصول خدا کہہ سکتے ہیں۔ جس میں بنیاد نبوت و وحی رہی ہے۔ بے شک یہ سب کچھ حضرت انسان کی بیداری اور شعور کے لیے تھا مگر اصول خدا کی بنا پر پیغام نبوت و وحی قطعی و یقینی علم شمار ہوتا تھا۔ اب علم انسانی استعداد عقلیں، حسیت اور وحدانیت کی بنا پر آگے بڑھے گا مگر اقدام و خطا کے نظام سے گزر کر قطعیت کی صورت اختیار کرے گا۔ ڈاکٹر فاروقی اسے دو جہتوں میں نمایاں کرتے ہیں:

۱۔ بالقوہ و بالفعل فطرت، فطرت انسانی کے دو پہلو ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں تضاد کا پہلو بہت واضح ہے مگر انسان کا کمال بھی اسی تضاد و کش مکش سے وابستہ ہے۔ گو یہ انفرادی یا فرد کے ساتھ وابستہ ہیں مگر فرد میں یہ کمال کی راہ پر نہ ہوں تو اجتماعی و قومی اور بین الاقوامی محاوروں کی ضرورتیں پوری نہیں ہوسکتیں۔ گویا بالقوہ و بالفعل فطرت کمال کی بھی ہے اور نقص بھی۔ اقدام و خطا کا معاملہ یہی ہے۔ کمال یہ ہے کہ بالقوہ فطرت کو ایسی تربیت سے گزارا جائے جو بالفعل فطرت کو غایت سے وابستہ رکھے۔ بالقوہ فطرت کے بنیادی خصائص میں فجور و تقویٰ کے امتیاز، ربوبیت کے اقرار، اپنی نفس کی بصیرت اور امانت کی ذمے داری شامل کیے جاتے ہیں جب کہ بالفعل فطرت جبلی و اعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی لقاصوں پر مشتمل ہے۔ (۳)

۲۔ دوسری جہت انسانی سرگرمیوں کے نتیجے میں اقدام و خطائیں، غلطی اور پھر اس کی درستگی کے عمل میں ایک سبق و تجربہ ہاتھ آتا ہے۔ اسے تجزلی توثیق و شہادت کا نام دیا جاتا

۱۔ المائدہ: ۲

۲۔ الاحزاب: ۴۰

۳۔ منہاج القرآن: ص ۱۳۴، ۲۰۰

ہے۔ ماضی قریب کی صدیوں میں علم کی اس حیثیت میں خوب ترقی ہوتی ہے لحہ لحہ موجود میں انسان زیادہ بااعتبار نظر آتا ہے۔

وحی قرآن میں آ کر مکمل ہوگئی مگر یہ وحی نبوت کا تسلسل ہے۔ وحی خاصہ انسان بھی ہے۔ بالقوہ فطرت کی نشوونما میں اور اس کے بعد کیا انسانی خاصہ وحی کا کوئی عمل دخل رہ جاتا ہے۔ یہاں تفصیل میں جائے بغیر اتنا کافی ہے کہ انسانی کے ساتھ خدا کا تعلق منقطع نہیں ہوتا۔ قرآن میں اس کی تائید موجود ہے اور یہاں اس کا تذکرہ موضوع یعنی زوال سے عروج کے ضمن میں کیا ہے۔ دور نبوت میں امت کی تشکیل ہوئی اور دور مابعد میں ایک خاص مدت کے بعد زوال کا شکار ہوگئی۔ آج ۱۴ سو سال بعد ہم امت کی تجدید نو پر مباحثہ کر رہے ہیں اور دماغ سوزی کر رہے ہیں۔ ہمیں صحیفہ انقلاب سی تازہ انقلاب کی آرزو ہے۔ وحی قران و سیرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا ایسی تجدیدی قوت موجود ہے؟ ڈاکٹر فاروقی اس کا جواب ہاں میں دیتے ہیں بل کہ دور مابعد نبوت کے صحیفہ انقلاب سے تازہ جستجو کی ضرورت ہی نہ پڑتی جو جدوجہد اور نتیجہ پیغمبرانہ قیادت میں حجۃ الوداع تک آ گیا تھا، وہ اگر ارتقا لیتے ہوئے اپنی روح کے مطابق برقرار رہا تو زوال کا مسئلہ ہی سامنے نہ آتا۔ امت مسلمہ ایک دفعہ قرآنی ہدایت اور پیغمبرانہ رہبری کے زیر اثر بین الاقوامی عروج پر فائز ہوگئی مگر مسکن پھر زوال ہوگیا، مؤثرات زندگی بدل گئی، رفتہ رفتہ بین الاقوامی سطح پر فساد کا غلبہ ہونے لگا ہو تو یہ جستجو لازم آئے گی کہ مسلمہ امت صحیفہ انقلاب قرآن مجید سے دوبارہ ہدایت طلب کرے اور اب یہ ہدایت ترتیب نزول و تلاوت سے لی جاسکتی ہے۔ (۱)

یہی تیسرے سوال کا جواب بھی ہے۔ انسانی مساعی سے حاصل علوم بے اثر ہوگئے۔ بے شک ان کا ماخذ سیرت مطہرہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن تھے۔ جو ماحول میثاق مدینہ سے خطبہ حجۃ الوداع تک بنانے وہ آگے پوری طرح برقرار نہ رہ سکا اور جو ماحول خلافت راشدہ میں بنا وہ ملوکیت میں قائم نہ رہ سکا۔ ملوکیت کا پہلا حصہ جس میں عوامی رائے کی تائید لی جاتی تھی، جو ماحول بنا وہ بعد میں قائم نہ رہ سکا اور یوں شکست ہوگئی۔ تاریخ کا اصول یہ رہا ہے کہ

۱۔ ایضاً: ص ۲۰۰

شکست وزوال کے بعد اس امت میں دوبارہ نبی آتا تھا اور اسے عروج پر گامزن کر دیتا تھا۔ اب ایسا ہونے والا نہیں ہے۔ اب امت کے اہل دانش کو اجتماعی وقومی اور بین الاقوامی سطح پر اس راز کو دریافت کرنا ہوگا۔ جو دوبارہ بعثت کا کردار ادا کر سکے۔ ڈاکٹر فاروقی کے نزدیک قران حکیم میں حجۃ من بعد الرسل کی طاقت موجود ہے جو امت کی تجدیدی مساعی میں یقینی حرکت ونتیجہ خیزی کا موجب ہے یوں اب آگے بڑھنے کے تین ذرائع ہیں جو آج لمحہ موجود میں بروئے کار لا کر غایت کو پا سکتے ہیں۔ اب غایت امت کی تشکیل نہیں ہے بل کہ تجدید امت ہے۔ زوال سے باہر آنے کی آرزو ہے۔ پیغمبر انقلاب کے سامنے تشکیل امت تھی اور اب پیغمبر انقلاب کی بنیاد پر تجدید وتعمیر امت ہے۔ اس فرق کو پوری طرح جانے بغیر حکمت عملی کا اندازہ ناقص ٹھہرتا ہے۔

تجدید امت کے تناظر میں ایک اور حقیقت کا ادراک ضروری ہے:

۱۔ امت سے مراد کیا ہجرت کے بعد اور خطبہ حجۃ الوداع تک اور میثاق ریاست مدینہ کے دائرہ کے تحت آنے والے لوگ اور علاقہ ہے؟

۲۔ امت سے مراد سقوط بغداد کے وقت جو لوگ وعلاقہ تھے، کیا وہ مراد ہیں؟

۳۔ پندرہویں/ اکیسویں صدی میں دنیا کے تمام ممالک میں پھیلے لوگ اور پچاس سے زائد مسلم مملکتیں بھی کیا امت کی تعریف میں آتے ہیں؟

درج بالا سوالات کو زیر غور لا کر یہ طے کرنا اس لیے ضروری ہے کہ غایت کا تعین اور لائحہ عمل آج درکار ہے۔ میثاق مدینہ کے تحت ریاست اور اس کا جغرافیہ جو عرب علاقہ وعرب تمدن پر مشتمل تھا، پیغمبرانہ قیامت میں ایک مثالی تبدیلی تھی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض نبوی کو ایک علاقے، ایک تمدن اور قریب قریب ایک ہی زبان کے لوگوں میں احسن طریقے سے نبھایا۔ ہر علاقے اور معاشرے میں کئی عصبیتیں ہوتی ہیں۔ عصبیت تو فطری ہے مگر غایت کے لیے کسی تمدن یا ریاست میں توازن بنانا کمال ہوتا ہے (۱) اور ہم دور نبوی کا یہ کمال ہمارے لیے مثال ہے۔ بلاشبہ دور خلافت راشدہ سے سقوط بغداد تک جہاں ریاست مدینہ نی

۱۔ مقدمہ ابن خلدون۔ ابن خلدون نے اس پر اچھی بحث کی ہے۔

وسعت اختیار کی، سب امت کا حصہ تھے۔ مگر اب علاقائی، قبیلائی، نسلی اور لسانی عصبتوں نے تو زان سے ہٹنا شروع کر دیا۔ یاد رہے عصبیت مٹتی نہیں بل کہ غایت کے تحت لا کر اس کو سود مند بنایا جاتا ہے۔ عصبتیں طاقت ور ہونے لگیں، غایت کم زور ہونے لگی، توازن بگڑنے لگا، اسے روکا نہ جاسکا اور غیر متوازن تمدنی و ریاستی مفالیت زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی تو ''سقوط بغداد'' ہو جاتا ہے۔ پھر ۱۲۵۸ء سے ۲۰۲۰ء تک امت کی انفرادی یا اجتماعی صورت میں باقی رہنے کی جو جدو جہد نظر آتی ہے وہ عرب میں نہیں، عجم میں نظر آتی ہے۔ لمحہ موجود میں قبائلی و عربی عصبیت پر عربوں میں ریاستوں کا قیام امت کے زوال کو مستحکم کرنے میں ایک بڑی وجہ ہے اور کیا بقول ڈاکٹر اسرار احمد تجدید امت کے لیے ہمیں عربوں کو بھولنا ہوگا اور باقی دنیا میں موجود امت کو یکجا کر کے مضبوط بنانا ہوگا؟ امت کی یہ تعریف تو بدل نہیں سکتی کہ جو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور وہ بھی آخری پر ایمان لائے گا، امت کا ممبر بن جائے گا اور دنیا کے کسی کونے میں ہو یا جا بسے، امت کا ہی حصہ شمار ہوگا۔ اس کے احساس انفرادیت کو اجتماعیت میں ڈھال کر تجدید امت ایک نصب العین ہے۔ جس کے تعین کی آج ضرورت ہے۔ عصبتیں پرانی بھی اپنا جگہ موجود ہیں اور کئی نئی پیدا ہوئی ہیں۔ نتیجہ ان کو متوازن کرنے سے آئے گا۔ دنیا میں تجربات ہوتے آرہے ہیں۔ ان سے سیکھنا اور ان کو بروئے کار لانے میں حرج نہیں ہے۔ ایسی صورت میں دو سوالات ابھرتے ہیں:

ا۔ کیا امت کی تجدید اول و آخر غایت و مقصد ہے؟

ب۔ کیا پیغام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ترویج اول غایت ہے؟

ایک لحاظ سے دونوں کا جواب لمحہ موجود میں ایک ہی ہے کہ ہم پیغام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترویج کے لیے تجدید امت کے خواہاں ہیں۔ اس کے باوجود پیغام محمد صلی اللہ علیہ وسلم رکا نہیں ہے۔ یہاں غلبہ اسلام کی قرآنی غایت کو مدنظر رکھیں تو تجدید امت سے غلبہ اسلام کا وہ پہلو ظہور پذیر ہوگا جو طاقت کا ہوگا اور یہ امت کی ضرورت اور ذمے داری ہے۔ بصورت دیگر پیغام نبوت کا علمی و فکری پہلو کسی دور میں رکا نہیں ہے کیوں کہ علم ہمیشہ معرض ارتقا میں رہتا ہے۔

ہم دوبارہ ڈاکٹر فاروقی کے انداز فکر کی طرف لوٹتے ہیں جو ان اصولوں کی تلاش میں عرق ریزی کرتے ہیں، جو ہمہ گیر ہوں۔ اس ضمن میں انہوں نے اس کامیاب دور کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے جو خطبہ حجۃ الوداع تک آتا ہے۔

دو اصول انہوں نے اس دور سے اخذ کیے اور ایک مابعد رسالت دور سے۔

ا۔ دور رسالت میں نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انقلاب ہیں۔

ب۔ قرآن صحیفہ انقلاب ہے۔

ج۔ مابعد رسالت انسان کی ذاتی استعداد کار سے علمی وفکری ارتقاء، جو لمحہ موجود تک جاری ہے۔

یہی تین اصول اپنا کر تجدید امت کے داعی ہیں۔ لکھتے ہیں:

کتاب (قرآن) کا سرچشمہ وحی ہے اور وحی کے علم کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی غایت کو پانا چاہیں، (جس کے لیے سورۃ الفاتحہ میں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ دعا کی جارہی ہے۔ جس میں ماضی، حال اور مستقبل کے تمام مسلمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک ہیں۔(۱)

تو اس کا قاعدہ یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ طے کیا جائے:

غایت یا نصب العین کیا ہو؟

حکمت قرآنی کو یقین کی اساس کیسے بنایا جائے۔

لائحہ عمل کو آج کے دور میں نتیجہ خیز کیسے بنانا ہے۔

عملی اساس کیا ہو؟

معیار و پیمانہ کیا ہو؟

نمونہ کمال کیا ہو؟

۱۔ منہاج القرآن: ص ۲۸۵

محمدی کیا ہو؟(۱)

تجدید امت کے لیے باقاعدہ مدارج کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان اصولوں کے باقاعدہ تعین وعمل کے بعد نتائج حاصل کرنے کے یہ مدارج عبور کرنے ہوتے ہیں۔ان مدارج میں مقصد کا شعور، مشکلات، رجوع الی اللہ، نظم وضبط میں باقاعدگی، اخلاق صالحہ، اتحاد، فی شناسی، عمرانی تنظیم، وفاداری، سخت کوشی، عدل، سرفروشی، بے غرضی، غلبہ حق، قانون کا اقتدار اور اقتدار کا تحفظ شامل ہیں۔(۲)

اوپر مذکور ابتدائی اصول امت کی پہچان ہیں۔ان کی فعالیت واثرات کو انقلابی لحاظ سے دوبارہ برپا کیے بغیر زوال کا مداوا ممکن نہیں ہے۔علم بالوحی اور پیغمبر انقلاب کی رہبری کے تاثر کو لمحہ موجود میں زندہ کرنا ہے۔اسے ڈاکٹر فاروقی علم بالوحی اور انسانی استعداد کار کے زائیدہ علم سے امتیاز دیتے ہیں۔(۳) عقلیت، حسیت اور وجدانیت یا تنقید کو انسانی استعداد کے زائیدہ علم کے اصول قرار دیتے ہیں۔(۴) ان اصولوں کا تعلق کم وبیش ہر دور کے ہر انسان سے رہا ہے۔امت کی تجدید کے عمل میں پیغمبر انقلاب اور علم بالوحی کی تازہ فعالیت کے ساتھ علم جدید کے ان اصولوں سے استفادے پر زور دیا گیا ہے۔علم بالوحی کو غایت کا علم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> علم بالوحی کے علم الغابات ہونے کے نقطہ نگاہ سے مسائل یہ ہوجاتے ہیں کہ انفرادی زندگی کے تینوں پہلوؤں (فکری، ایمانی اور اخلاقی) میں سے ہر ایک کی اصلاح طلب خاصیت اور اس کی اصلاح پذیری کیا ہے اور ان کی اصلاح کسی نصب العین کے حصول کی جدوجہد کے حوالے سے ہوگی۔(۵)

''انسانی مرتضیٰ بننا انسانی نصب العین ہے۔یعنی ایسا انسان جو خدا کی خوشنودی حاصل

۱۔ایضاً:ص۲۴۹

۲۔ایضاً:ص۲۸۱

۳۔ایضاً:ص۲۶۶

۴۔ایضاً:ص۶۵

۵۔ایضاً:ص۲۴۲

کر سکے۔ اس کا طریقہ علم بالوحی سے میسر آتا ہے۔ اس کی شہادت یہ ہے کہ ایمان باللہ انسان کی جبلی درعیات، طبعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں پر غالب آ جائے۔ (۱) دوسری طرف بعثت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت کا مقصود یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر دین حق غالب آ کر رہے۔ جیسے سورۃ توبہ: ۳۳، سورۃ فتح: ۲۸ سے عیاں ہے۔

انسانی استعداد (عقلیت، حسیت اور وجدانیت) کو ''علم ادم الاسماء کلمہ'' کا تسلسل اور نتیجہ خیز قرار دیتے ہیں البتہ زمینی حقیقت میں وحی کا اشارہ سودمند رہتا ہے۔ انسانی استعداد کا یہ علم معرض ارتقا میں رہتا ہے۔ اس کی نشوونما ابھی اتمام کو نہیں پہنچی اور یہ ارتقائے انسانی کے ساتھ جاری رہے گا۔ دور قدیم ہو یا وسطی یا دور جدید ہو، انسانی استعداد کا علم اثابت، نفی اور تطبیق کے مدارخ سے گزرتا آ رہا ہے۔ اگر تضادات زیادہ بڑھ جائیں تو یہ عمل سست ہو جاتا ہے۔ اور تطبیق کم زور ہو جاتی ہے۔ (۲)

زوال کا مداوا اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروری میں مضمر ہے

ہم مسلمان اسلام کی بنا پر ایک قوم ہیں۔ دین کی اساس پر ایک امت ہیں اور ایک نظام افکار کے حاصل ہونے کے لحاظ سے ایک پارٹی ہیں۔ بہ حیثیت ایک قوم کے ہمارا محرک اسلام ہے۔ بہ حیثیت ایک امت کے ہماری دعوت غلبہ اسلام یعنی من اللہ قانون کا غلبہ ہے اور بہ حیثیت ایک پارٹی کے ہماری وفاداری اپنے ہادیٔ اعظم اور اللہ کے آخری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر مرکوز ہے۔ یہ محرک، یہ دعوت اور یہ وفاداری محض معتقدات کلامیہ نہیں ہیں بل کہ تاریخی حقائق ہیں۔ ان حقائق نے ابتدا ہی سے اسلام کو سبز و شاداب رکھا ہے لیکن ایک فرد کی طرح ایک بہت عمرانی بھی زوال و انحطاط اور موت سے ہم کنار ہوتی ہے۔ اجتماعی قوت عبارت ہے غایت کی بصیرت کے خیرہ ہو جانے، تصور کائنات کے مسخ ہو جانے اور

۱۔ ایضاً: ص ۱۳۷

۲۔ ڈاکٹر فاروقی کا یہ مضمون ''نظریاتی بحران کا مداوا کیا ہو'' نوائے وقت میں ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو پہلے پہل شائع ہوا۔

نظام افکار کی روح کے فنا ہو جانے سے۔(۱)

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کے ان الفاظ سے ہم ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کو موجودہ زمینی حقائق کے اندر پیروی کے لائحہ عمل کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں۔ یہ پندرہویں/ اکیسویں صدی کی عقلی، حسی، سائنسی اور تخلیقی فضا ہے۔ موجودہ فضا و ماحول کی قیادت غیر امت اقوام کے ہاتھوں میں ہے۔ مسلم قومیں طفیلی کے طور پر دوسروں کی قیادت میں زندگی گزارنے کی خوگر ہو چکی ہیں۔ ہم ایک ارتقائی تعبیر اپنی نسلی کے لیے کر سکتے ہیں کہ مذہب اب عملی شکل ڈھال چکا ہے۔ تصورات سے عمل کے راستے پر ہے۔ دوسری طرف مذہب کو عقلی، حسی، سائنسی دلائل سے رد کیا جا چکا ہے۔ اپنی تسلی کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رد کیا جانے والا اسلام نہیں، مسیحیت تھی کیوں کہ رد مذہب کی قوتیں ساری کی ساری مغرب کی تھیں اور ان پر ناروا تسلط پادرہ کا تھا۔ ہمارے مولوی حضرات کا نہیں تھا۔ اس لیے وہ سارا ردعمل مذہب عیسوی و موسوی کے خلاف تھا۔ تسلی جہاں ہماری نہیں ہوتی، وہ یہ ہے کہ اسلام رد تو نہیں ہوا مگر اس وقت ہے کہاں؟ گویا مغرب میں مذہب رد ہو گیا اور مسلم ممالک میں مذہب اسلام باقی نہ رہا۔ غلامی، افلاس، جمود اور تقلید میں اسلام باقی نہیں رہتا۔ ہاں چند عباداتی طرز رسوم و رواج اور چند عباداتی اوراق علم کی صورت ضرورت اختیار کیے ہوئے ہیں اور ہم ان ہی کو اسلام سمجھتے ہیں اور دوسروں کے طفیلی ہونے پر قناعت کیے ہوئے ہیں۔ اس ماحول میں جب ہم اسوہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور علم بالوحی کی آبیاری کی بات کرتے ہیں تو آسان بات نہیں کرتے ہیں۔ بات اس لیے کرتے ہیں کہ اس کے علاوہ چارہ نہیں ہے۔ بات اسلام کی بھی نہیں، وہ الوہی پیغام ہے، خود رو ہے، اپنی طاقت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کا محتاج نہیں رہا ورنہ اب تم نام ہی نہ ہوتا۔ مجبوری مسلمان کہلانے والی امت کی ہے۔ ہماری حقیقت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اس کے علاوہ ہماری اور کوئی پہچان نہیں ہے اور نہ بن سکتی ہے۔ اوپر مذکورہ اقتباس ہماری کیمیائی بناوٹ کی ایک جھلک ہے۔ زوال ہوا جو فطرت کا قانون ہے۔ تسلیم کیے بغیر اگلی بات پر سوچنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ زوال

۱۔ ڈاکٹر فاروقی کا یہ دوسرا تذکرہ مضمون ''ہمارے زوال کا مداوا'' مذاراث مذہبی اور اسلام آباد میں ''سیرت کانفرنس'' کے تحت ۱۹۷۸ء ''مقالات سیرت'' میں شائع ہوا۔

ہوا ہے اور مدت ہوگئی ہے۔ ہمیں تسلیم ہے ہم محکوم، افلاس زدہ اور طفیلی ہیں، تسلیم ہے۔

اب اگلا مرحلہ یہ آتا ہے کہ کیا اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور علم بالوحی کی پیروی میں تجدید ملت کی کوئی ضمانت موجود ہے؟ اگر کوئی ضمانت موجود نہ ہو، تو زندگی میں موجود کئی دوسرے نظریات و موثرات موجود ہیں اور کم و بیش ان پر عمل پیرا بھی ہیں تو کیوں نہ فیصلہ کن انداز میں ان پر ایمان لے آئیں اور یک سوئی سے انفرادی و قومی زندگی کو خوش حالی، اطمینان اور مسرت انگیزی کے راستے پر ڈال دیں۔ اگر اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور علم بالوحی میں تجدید ملت کی ضمانت موجود ہو، فلاح دنیا و آخرت اور خوف و غم سے نجات کی کوئی عملی صورت نکل سکتی ہو، تو اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور علم بالوحی کی پیروی کے راستے موجودہ ماحول اور فضا میں ڈھونڈیں۔ اس تحریر میں بنیادی بحث ہی یہی ہے کہ خطبہ حجۃ الوداع تک اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور علم بالوحی کی پیروی میں ایک نتیجہ خیز مثالی اور نمونہ موجود ہے۔ جب کہ اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور علم بالوحی کی آج لمحہ موجود میں پیروی ممکن بنا سکتے تو تجدید ملت کی ضمانت موجود ہے۔

''اسوہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم'' انفرادی، اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی زندگی کا ایک نمونہ ہے۔ اس میں غایت کا تعین اور اس کے حصول کا طریقہ کار موجود ہے۔ اس بات پر تو ہمارا یقین سلامت ہے لیکن اس منہاج کو آج دوبارہ بروئے کار لانے اور عمل پیرا ہونے پر ہمارا یقین سلامت نہیں ہے۔ موجودہ ماحول میں بیٹھ کر منہاج سیرت کو عملی شکل میں ڈھالنے کے لیے جن معلومات کی ضرورت ہوگی، وہ ہمیں ''علم سیرت'' سے میسر آئیں گی۔ علم سیرت کے حصول کے لیے ''علوم السیرۃ'' کے تحت جو اصول و ضوابط مرتب شدہ ہیں، زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئے ہیں۔ علوم القرآن، علوم الحدیث اور علوم الفقہ پر جس فنی معیار کے مطابق کام ہوا ہے، علوم السیرۃ'' پر نہیں ہوا۔ اسلامی ادب میں علوم کی اصطلاح علم سے زیادہ علم کے اخذ و کشید کے اصولوں اور ضوابط کا احاطہ کرتی ہے جس کی بنیاد پر ''علم'' کی تنظیم ہوتی ہے۔ اوپر مذکورہ تینوں اصطلاحیں اس ذیل میں آتی ہیں۔

''علوم السیرۃ'' پر کام کی ضرورت ہے۔ علم سیرت کو آج سود مند بنانے کے لیے نئے

سرے سے علوم وفنون کی تنظیم سازی درکار ہے۔ پیغمبر انقلاب صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت شخصی تعمیر میں غایت، یقین اور ولولہ کی ضامن ہے۔

علم سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں سیرت سازی امت کا مسئلہ ہے اور اب اب یہ شدید تر اس لیے ہے کہ پندرہویں/اکیسویں صدی کے اس موڑ پر قوموں نے قانون کا ایک زبردست نظم ونسق قائم کرلیا ہے۔ اخلاقی تربیت بھی قانون کا حصہ بن گئی۔ سیرت سازی میں آزادانہ اخلاقیات کی نسبت قانونی پیروی کا دخل زیادہ ہوگیا ہے۔ امت کے افراد جہاں کہیں ہیں، نہ اخلاقی پرواہ اور نہ قانونی پیروی۔ اگر امت کا فرد بدلتا ہی نہیں ہے تو مان لینا چاہیے کہ ہمارا نظام، اسے جو بھی نام دے پس، اپنی تسلی کے لیے بے شک اسلام کا نام لے لیں، داخلی وخارجی سطح پر ناکام ہو چکا ہے۔ ناکامی کو پوری طرح ہم تسلیم کرنے سے انکاری ہیں اور تقلید کے فریب میں قید ہیں۔ قید تقلید سے نکل کر میدان تخلیق میں سرگرم ہونا شرط ہے۔ تخلیق میں اعتماد درکار ہے جو تعمیر شخصیت سے آتا ہے۔ تعمیر شخصیت ایک تربیتی نظام کار سے ممکن ہوتی ہے۔ جاریہ دور میں یہ ریاستی قانون سازی اور تربیتی نظام کے تحت ہو رہی ہے اور نیا قابل عمل اخلاقی فلسفہ جنم لے چکا ہے۔ یہ ترقی یافتہ ممالک کا نظام کار ہے۔ مسلم ممالک کسی قانون سازی اور تربیتی نظام کے پابند ہیں اور نہ اہتمام کر پائے ہیں۔ وجہ قید تقلید میں رہتے ہوئے اعتماد کا فقدان ہے۔

بے شک نظام کار قانونی وتربیتی ہو اور ریاستی بالادستی کے تحت ہو، سیرت سازی ایک ''غایت'' کے تحت ہوتی ہے۔ آج بھی ہر ریاست ایک مقصد کا تعین کرتی ہے اور پھر اپنے شہریوں کی تعمیر سیرت کرتی ہے۔ تعمیر سیرت آج ہو یا تمدن عرب میں ظہور نبوت سے حجۃ الوداع تک ہو یا بعد ازاں، ایک غایت کو مدنظر رکھ کر چار مدارج کے تحت کی جاتی ہے:

۱۔ غایت کے تحت فرد کی انفرادی تربیت یعنی فرد کی ذاتی شخصیت سازی۔

۲۔ غایت کے تحت اجتماعی پہلوؤں کی تربیت جو کسی بھی تمدن میں بہ طور کردار درویہ منقول ہو۔

۳۔ غایت کے تحت قومی نقطہ نظر سے ذہنی وعملی تربیت، کیوں کہ یہ باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی شرط ہے۔

۴۔ غایت کے تحت دوسری اقوام سے دوستی وتصادم کے نقطہ نظر سے ولولہ انگیز تربیت۔

''غایت'' کو پانا اگر نصب العین ہو، تو ''غایت'' کا تعین درکار ہے۔ غایت کے حصول کے لیے ایک انفرادی، اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر سیرت و کردار درکار ہے۔ نظام تربیت غایت کی نسبت سے ہی ممکن ہے۔ جس میکانزم کوئی بھی، وہ وقت و ماحول سے پیدا ہوتا ہے اور ریاستی ذمے داری وسرپرستی میں ممکن ہوتا ہے۔ ہمارا مسئلہ اب غایت کا تعین بنا ہوا ہے۔ ہم تقلید کے خوگر اور تخلیقی سے خوف زدہ کارکنان امت اپنی قومی غایت ان عبارتوں میں تلاش کرتے ہیں جو خود غایت کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ یہ تاریخ کی رواں کہانی ہے۔ تقدس کو ذہن سے کچھ دیر کے لیے دور کریں اور علم کو جگہ دیں جس کے لیے یہ کائنات بنی، انبیاء آئے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت، تزکیہ اور حکمت کے تحت علم سکھایا۔(۱)

''غایت'' ہماری آج بھی دور رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے جہاں غایت کے تعین کے بعد تلاوت، تذکیہ اور حکمت کے تحت افراد کی تربیت کا اہتمام کیا گیا۔ یہ اس دور کا نظام کار تھا اور قیادت پیغمبرانہ تھی۔ دور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ایک تربیتی نمونے کے طور پر آج بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ''غایت'' آج پندرہویں/اکیسویں صدی میں رہتے ہوئے دور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اٹھانی ہے، اخذ وکشید کا یہاں سوال نہیں، اخذ وکشید وحی و احادیث اور دوسری عبارتوں کا سوال ہے۔ ''غایت'' کے اٹھانے کے لیے اجتماعی وقومی اعتماد کی ضرورت ہے۔ ریاستی اتھارٹی کی ذمے داری ہے۔ آزادانہ طور پر علماء وحکماء کی ذمے داری یہ ہے کہ ''غایت'' کی نشان دہی کریں اور قوم وریاست کے اندر جوش وولولہ اور اعتماد و یقین بھریں۔ مسلم ادب میں فرد کو افراد پر فوقیت دینے کی روش سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ دنیا علمی بیداری وشعور کے حوالے سے بہت آگے جا چکی ہے۔ یہ نقل کا دور نہیں بل کہ عقل وحس کی بنا پر دلیل کا دور ہے۔ امت کے لیے ''غایت'' کے تحت آگے بڑھنے کے لیے اجتماعی قومی و ریاستی فورم کو ''غایت'' کی نسبت سے طاقت دینی ہوگی۔

''غایت'' اٹھانا پہلی بات ہے۔ ''اٹھانا'' یہاں قابل غور ہے۔ جست جو لگانی درکار

۱۔ البقرہ: ۱۵۱

ہے، وہ پندرہویں/ اکیسویں صدی کے اس موڑ پر درکار ہے اور بیچ کی تمام صدیوں کے اوپر سے گزر کر دور رسالت میں اترنا ہے۔ جست کی یہ قوت پیدا کیے بغیر بھول جائیں کہ زوال کو عروج میں بدل سکیں گے۔ یہ اعتماد وقوت بہ حیثیت امت اجتماعی سطح پر درکار ہے۔ دوسرا ہم نے دور رسالت سے ''قیادت'' اٹھانی ہے۔ گویا دو چیزیں دوبارہ بہ راہ راست اٹھا کر آج کی مسلم دنیا میں لانی ہیں:

۱۔ غایت

۲۔ قیادت

ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہم ''غایت'' اور ''قیادت'' کھونے کی بنا پر دنیا سازی وانسانیت پروری کے میدان سے باہر ہو گئے ہیں۔ ''غایت'' کے ساتھ ''قیادت'' بھی ہمیں دور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اٹھانی ہے۔ لحہ موجود میں فیضان محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ ایک الگ بات ہے جس کا موضوع آنکھ سے نہ دیکھی جانے والی دنیا مراد ہے۔ ہمیں بھرپور اور مکمل وہ انقلابی قیادت درکار ہے جس نے دور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں کامیابی حاصل کی۔ دور رسالت کی ''قیادت'' ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھی اور ''غایت'' کا تعین بھی رسالت پر مامورگی کے بعد ہدایت الٰہی (علوم بیالوجی) کی بنیاد پر کیا گیا۔ ''قیادت'' کے عناصر نور نبوت وشعور نبوت کو قرار دیں تو ان سے پیدا ہونے والا تاثر، جذبہ کولہ اور ولولہ انگیزی قیمتی احساس و اساس ہے۔ نور، شعور، تاثر، جذبہ محرکہ اور ولولہ انگیزی کے ساتھ قیادت اٹھانی ہے۔

امت میں ''قیادت'' کا فقدان ''قیادت رسول صلی اللہ علیہ وسلم'' ہی سے پورا کیا جانا قرین قیاس ہے۔ ''غایت'' و ''قیادت'' کے تعین کے بعد اس کی اخلاقی ذمے داری اجتماعی قیادت یعنی رہائشی اتھارٹی کے تحت آجاتی ہے۔ اجتماعیت یا ریاستی اتھارٹی جسے امت کا اعتماد حاصل ہو، دوسرے لفظوں میں ہر مسلم ملک میں اجتماعت یا ریاستی اتھارٹی کو عوامی سبقت یا رائے حق دہی کی تائید حاصل ہو۔ کسی نظام کو اپنائے بغیر کوئی غایت وقیادت نتائج پیدا نہیں کرسکتی۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ''غایت'' کا تعین اور ''قیادت'' کی منظوری باقاعدہ جمہوری خلافت کے تقاضوں کے مطابق لی اور عوام بمع غیر مسلم ساتھ لے کر آگے بڑھے۔ آج انسانی علم وتجربات سے جو نظام کارآمد ثابت ہے، اسی کو اپنا کر غایت کے لیے

جدوجہد کرنی ہوگی۔ نظام کار آمد جب نہیں رہتا تو کوئی دوسرا آ جاتا ہے۔ ''غایت'' برقرار رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

''جست'' جو پندرہویں/ اکیسویں صدی میں رہ کر واپس ''دور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم'' تک لگانی ہے۔ اسے مومن کے سفر ''معراج'' پر قیاس کرلیں۔ یہ سنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی تو ہے کہ عظیم تر پانے اور مشاہدے کرنے کے لیے سفر معراج اختیار کرنا پڑتی ہے۔ جس علم اسپرٹ اور علم بالوحی کی ہمیں آج ضرورت ہے۔ جس غایت اور جس قیادت کی ہمیں آج ضرورت ہے۔ جس نور ہدایت اور قائد الی الخیر کی ہمیں آج ضرورت ہے۔ وہ دور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے میسر آتا ہے۔

اسوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رواں عمل ہے۔

سیرت کی تعمیر ایک رواں کہانی ہے۔ امت کے افراد نے بعد از دور رسالت صلی اللہ علیہ وسلم جلد ہی ''غایت'' بھی کھودی اور قیادت کے بحران کا شکار ہوگئے۔ کمال کہانی یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت و وفاداری کا جذبہ ماند نہیں ہوا۔ قرآن کی سحر انگیزی سی دل نہیں بھرا۔ کشتی امت کی ہچکولے تو کھاتی رہی مگر ڈوبی نہیں۔ گویا یہ امت کے دو پہلو ہیں اور دونوں پہلو بہ پہلو صدیاں عبور کر آئے ہیں۔ یہ امت کے تجربات ہیں۔ یہ امت کی تاریخ ہے۔ انہیں نظر انداز کر کے کسی نئی کوشش میں کامیابی کے امکانات اس لیے ہوجاتے ہیں کہ تجربات بنیاد نہیں ہوتے۔ تصورات ہوتے ہیں۔ یہاں امت کے تصورات و تجربات کی تفصیل میں نہیں جائیں گے۔ گزشتہ سطور میں ڈاکٹر فاروقی کے حوالے سے امت کی تاریخ کو سات ادوار میں تقسیم کر کے وضاحت و بیان کی نشان دہی کر چکے ہیں۔ ہم یہاں تفصیل میں جائے بغیر ان دو پہلوؤں کی نشان دہی پر اکتفا کریں گے:

ا۔ افراد امت نے بتدریج خلافت راشدہ کے بعد ''غایت'' کھودی۔

ب۔ افراد امت نے بتدریج خلاف راشدہ کے بعد ''قیادت'' کھودی۔

البتہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علم بالوحی کی بنا پر کمال سیرت سازی کو نمودی، اس کا کمال نتیجہ آج تک برقرار ہے۔ اور امت کا جوہری سرمایہ ہے:

ا۔محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وفا، عقیدت اور عشق نہ مٹا۔

ب۔قرآن کی سحر انگیزی اور علم بالوحی پر یقین نہ ٹوٹا۔

یہی وجہ ہے کہ غلبہ دین حق ایک جذبہ محرکہ کے طور پر پوری ولولہ انگیزی کے ساتھ امت کی رگوں میں دوڑتے خون کو گرم اور سرگرم رکھتا ہے۔

ہمارے پاس اس وقت چودہ صدیوں کا تجربہ بھی موجود ہے اور ''علم'' بھی موجود ہے۔ غالب قوتیں طاقت کے ساتھ موجود ہیں اور محکوم قومیں تقلید کے ساتھ معذور ہو کر تابعداری کے لیے موجود ہیں۔تمام مسلم اقوام آخر الذکر کٹیگری میں آتی ہیں۔ہم ''غایت'' اور ''قیادت'' کی بات علم و تجربات کے نصف النہار پر کر رہے ہیں۔وفا، عقیدت اور عشق کی باتیں بھی اسی مادی دوپہر میں زندہ و بیدار دیکھ رہے ہیں۔

علم و تجربات ایک جوہری طاقت حاصل کر چکے ہیں۔علم و تجربات کی صدیوں طویل کہانی کے پیچھے خدا کا ہر نائب شامل ہے۔نظام نبوت میں قرآن کو جامع علم اسی ارتقائی کہانی کی توثیق ہے اور گزشتہ چودہ صدیوں میں جو حاصل ہے۔نائب اور علم کی رواں کہانی ہے۔اس کہانی سے امت الگ نہیں ہے۔یہ انسانی سیرات ہے۔آج کا حاصل علم و تجربے کا جدید میکانزم ہے اور امت کو رواں میکانزم ہی اپنا کر ''غایت'' و قیادت'' کو موثرات زندگی میں بدلنا ہے۔علم و تجربے کو ہم ''کفر'' کے حوالے کر کے اپنی غایت و قیادت کی کارگزاری پر عدم اعتماد کے مرتکب ہوتے ہیں۔

یہ ساری علمی کہانی ''علم آدم الاسماء کلا'' کی کہانی ہے۔(۱) ''ارْجِعِيٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً'' (۲) ''غایت'' کا شخصی نصب العین ہے۔ خَلَقَكُمْ مِّن نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۳) اجتماعیت، قومیت اور انسانیت کی حقیقت کا بیان ہے۔ مَّا لَهُمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ (۴)

۱۔البقرہ:۳۱

۲۔الفجر:۲۸

۳۔النساء:۱

۴۔البقرہ:۱۵۱

''قیادت'' (نبوت) کی معجزہ کاری ہے۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ (۱) انسانی استعداد کی تصدیق ہے۔ لَا یُحِیْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا (۲) محض علم نہیں، وجدان کی قوت بھی نائب کو میسر ہے۔ ''علمیات'' ایک جامع اصطلاح کے طور پر ظہور پذیر ہوئی ہے جس کے تحت علم کی ہر شاخ و جہت زیر بحث آتی ہے۔ دعویٰ، جواب دعویٰ اور تطبیق کے ایک طویل مباحثہ سے گزرتی ہے مؤثر میکانزم اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں فائدہ علوم کا تذکرہ مقصود ہے:

۱۔ مذہبیت

۲۔ عقلیت

۳۔ تجربیت

۴۔ وجدانیت

۵۔ تخلیقیت (۳)

درج بالا علوم کسی طور پر اسلام سے غیر نہیں ہیں۔ امت استفادے سے محروم جا رہی ہے تو یہ اسلام کا مسئلہ نہیں ہے۔ امت کا امتحان ہے۔ اسلام کا زوال کہنا درست نہیں ہوگا۔ پیغامِ نبوت اور علم بالوحی خوش بو کی طرح خود رو انداز میں انسانیت کی سانسوں میں سے ہو کر آگے بڑھا ہے اور اوپر مذکورہ جیاتِ علوم کے لفظ لفظ میں سمویا ہے۔ امت نے ''غایت'' اور ''قیادت'' کھو دی تو غیر آدرراہیں بھی گم کر دیں۔ جاریہ صدی کے اس موڑ پر امت کے افراد اگر ''غایت'' اور ''قیادت'' تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں تو امت کو پھر بھی بات کا ڈر باقی رہ جاتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وفا و عقیدہ فولاد کی طرح مضبوط اور علم بالوحی کی قوت پر یقین کی قوت حاوی ہے تو امت کا ناکامی کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ زمانے پر مادی قوتوں کا غلبہ ہے۔ امت کو مادی و روحانی قوت کا حصول مذکور چاروں جوہر اصولوں سے میسر آ سکتا ہے۔ امت کے لیے چیلنج نہ یہ علوم ہیں اور نہ روحانیت سے خالی مادی قوتیں ہیں۔ ہمارا چیلنج

۱۔ القیامہ: ۱۴

۲۔ طٰہٰ: ۱۱۰

۳۔ ملاحظہ ہو: ص ۹۵، حوالہ ۲

تنقید و تطبیق ہے۔ دعویٰ اور جواب دعویٰ ایک مباحثے کی شکل ہے۔ اسے قانونی تضاد بھی کہا گیا ہے۔ قرآن نے اس کی باقاعدہ تصدیق اور تفصیل بیان کی ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ۔ (۱)

اور اس طرح ہم نے بنا دیا ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے ایک شخص

نبی کے دعویٰ کو چیلنج کیا گیا، قرآن و واقعات سیرت سے عیاں ہے۔ امت کے افراد کے اوپر چاروں مذکورہ جوہری صلاحیتوں کے ساتھ تندیق و تطبیق کے چیلنج سے گزرنا ہوگا۔ یہاں اہلیت درکار ہے۔ اوپر مذکور پانچوں علوم کی گہرائی میں جائے بغیر وہ اہلیت میسر نہیں آئے گی، جو کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ جیسے قبل ازیں نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ محض علماء حکماء کے آزادانہ و انفرادی دماغ سوزی سے نتیجہ خیز نہیں ہوسکتا۔ یہ محرک کا کام تو دے سکتے ہیں مگر تنقید و تطبیق کو فیصلہ کن فکر و قانون اجتماعی و قومی سطح کے انتظام پر منحصر ہے جو آج کل پارلیمان کا انتظام ہے۔ پارلیمان کی اہلیت ہی قومی راہنمائی کے لیے فیصلہ کن ادارہ ممکن ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے، مباحثہ، جواب دعویٰ اور دعویٰ کی کہانی ہے۔ امت کے سامنے دو محاذ ہیں:

ا۔ موجودہ مسلم معاشروں میں ''غایت'' اور ''قیادت'' کے میل جول سے نتائج کیسے پیدا کریں؟

ب۔ آفاق کی سطح پر پھیلی دنیا کے بین الاقوامی محاذ پر موجودہ تجرباتی علوم کی موجودگی میں امت کی طرف سے دعوت و عمل کیا ہو؟

سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دو واضح حصے ہیں اور دونوں کے تعلق کو سمجھنا ضروری ہے: اول جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خود موجود تھے اور یہ مدت خطبہ حج تک محدود ہے جس پر بات ہو چکی ہے۔

دوم جب اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دار البقاء کی طرف چلے گئے تو باقی صورت حال کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے:

۱۔ الفرقان: ۳۱

۱۔ مابعد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم عبارات وحی واحادیث کا سرمایہ باقی ہے۔

۲۔ مابعد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم وحی واحادیث کا سرمایہ باقی ہے۔

۳۔ امت کے افراد باقی ہیں۔

علم بالوحی الفاظ سے صورت علم وہ اور صورت سیرت تب اختیار کرتا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارکہ سے ادا ہوتے ہیں اور عملی ہوتا ہے۔ یہی ادا ہونے والے الفاظ قرآن وحدیث کہلاتے ہیں۔ ان الفاظ یا ان کی روح کے مطابق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فعالیت اختیار کرتے ہیں تو وہ سنت کہلاتی ہے۔ الفاظ کی ادائیگی اور ذاتی مفالیت سے تمدن کے، فعالیت اختیار کرتے ہیں تو وہ سنت کہلاتا ہے۔ سیرت ایک سیل رواں ہے جو انسانوں میں سے گزر کر نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ علم بالوحی وسیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اثرات گزشتہ چوداں صدیوں پر پھیلے ہیں۔ مسلم تمدن پر اثرات کی نوعیت الگ ہے اور غیر مسلم معاشروں پر دوسری نوعیت کی ہے۔ علمیات پر محسوس اور غیر محسوس اثر موجود ہے۔ تفصیلی کامیابی توقع نہیں ہے البتہ اس تناظر میں ہم سوالات کی صورت میں دعویٰ (اثبات)، جواب دعویٰ (نفی) اور تطبیق (تنقید) کے عمل کے لیے بروئے کار لائیں گے:

۱۔ کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فریضہ نبوت خطبہ حجۃ الوداع تک اتمام کو پہنچ گیا یا یہ بصورت امت جاری ہے اور جاری رہ سکتا ہے؟

۲۔ مقاصد علم وحی کیا دور رسالت کے اختتام پر پورے ہو گئے یا ابھی پورے ہونے باقی ہیں؟

۳۔ غایت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور علم بالوحی پوری نہیں ہوتی تو بعد از دور رسالت اور اب تک کیا صورت رہی؟

۴۔ فریضہ نبوت کی جاریہ صورت افراد امت کے ہاتھوں منتقل ہوئی، تو یہ کہاں تک فریضہ ادا ہوا۔

۵۔ فریضہ نبوت کی ادائیگی کی اب صورت کیا ہے؟

ایسے متعدد سوالات بے باک مباحثے کے متقاضی ہیں۔

''غایت''، ''قیادت'' کے میل جول سے ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' وجود میں آتی ہے۔ ''علم بالوحی'' اور ''پیغمبر انقلاب'' کی فعالیت کا نتیجہ ''اسوہ حسنہ'' ہے جس کی تائید قرآن ان الفاظ میں کرتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۱)

بے شک ہم نے تمہارے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں بہترین نمونہ رکھا ہے۔

غایت کے تحت وحی ایک علم ہے جسے حضرت نائب کے لیے سود مند بنانا مقصود تھا اور مقصود رہا ہے اور مقصود ہے۔ ''قیادت'' یا ''اسوہ حسنہ'' کے تحت ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل و فعالیت مطابق ہدایت الٰہی ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' ایک سود مند نمونہ اور علم ہے۔ وحی محض ایک ہدایت ہے جسے عمل سے گزرنا ہوتا ہے۔ ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' وحی کا عملی نمونہ اور نقشہ ہے۔ علم بالوحی کو تصور و ہدایت سے نمونہ و مثال بننا ہوتا ہے۔ ایک ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل و فعالیت سے گزر کر نمونہ و مثال بننا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب ذات النبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے رخصت ہو جائیں تو ''وحی'' کو نمونہ کیسے بننا ہے اور ''قیادت'' کس نے کرنی ہے؟ ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتمہ ہو گیا۔ قیادت کا تسلسل البتہ موقوف نہیں ہوا جو ''وحی'' اور ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے تال میل سے برقرار رہنا قرار دیا ہے۔ یہ نائب حق ہے جو وحی پر ایمان اور ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا پیروکار ہو گیا گویا ''انسان'' کو وحی کی تفسیر و تعبیر کا اختیار مل گیا اور سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم بہ طور نمونہ علم میسر آ گئی ہے۔ قرآن میں انسان کو تغیر و تعمیر کے اختیارات پر متعدد آیات میں مختلف انداز سے خطاب کیا گیا ہے۔ یاد رہے انسان خدا کا نائب ہے اور خدا نے بہ طور نائب اس میں اعلیٰ پیمانے کی بصیرت و اہلیت رکھی ہے۔ نظام وحی انبیاء زمان و مکاں کی نسبت سے انسان کو سکھانے کا عمل ہے۔ وہ سیکھتا ہوا آگے بڑھا ہے اور جب انسان کو مناسب علم حاصل ہو گیا تو نظام وحی انبیاء کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔ ذات محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کا اختتام اور قرآن کی جامعیت پر

۱۔ احزاب: ۲۱

وحی کا خاتمہ دراصل حضرت نائب کو سہاروں سے آزاد کرنے کا اعلان ہے، تاکہ وہ ''علم آدم الاسماء کلا'' کی رو سے اپنے تدبر کے ساتھ آگے بڑھے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيٓ أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ (۱)

بے شک ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔

بَلِ الْإِنْسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝ (۲)

بل کہ انسان اپنے اندر کافی بصیرت رکھتا ہے۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَىٰهَا ۝ (۳)

انسان کو منفی کاموں سے بچنے اور مثبت کاموں کی سمجھ حاصل ہے۔

یوں ہم ''غایت'' (علم بالوحی)، قیادت (ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اور ''سیرت'' (اسوہ حسنہ) کے ساتھ دور مابعد رسالت میں داخل ہوجاتے ہیں۔ یہ دور آزاد کردہ نائب حق کا ایک پہلو سے ہے اور دوسرے پہلو سے تمام نائبین اس دور کے آزاد کردار شمار ہوں گے۔ یوں ہم وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ ہی کے تحت دور کو دو حصوں میں تقسیم کر لیتے ہیں اور دونوں حصوں میں رونما ہونے والے واقعات وعلوم کو پندرہویں/اکیسویں صدی تک لاتے ہیں۔

اول: مسلم فعالیت سے مرتب ہونے والی تاریخ اور علم۔(۴)

دوم: بہ حیثیت مجموعی انسانی فعالیت سے مرتب ہونے والی تاریخ اور علم۔(۵)

تفصیل میں جائے بغیر انسانیت کی مجموعی کوششوں (مسلم وغیر مسلم) سے ''علمیات'' کے تحت مرتب علوم کے بتکرار تذکرے کے بعد آگے بڑھتے ہیں اور ''علم سیرت'' کے تعین میں تجویز کو زیر بحث لاتے ہیں۔ گزشتہ صدیوں کی حاصل ''علمیات'' انسان کا سرمایہ ہے:

۱۔ التین: ۴

۲۔ القیامہ: ۱۴

۳۔ الشمس: ۷

۴۔ منہاج القرآن: ص ۳۱

۵۔ تاریخ اور علوم پر مقدمہ ابن خلدون کے علاوہ آرنلڈ ٹائن بی، زوال مغرب انوار شپکلر اور مقدمہ تاریخ سائنس از جارج مارٹن ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ مذہبیت کے تحت تجربے سے یہ ثابت ہوا کہ شخصیت سازی میں مذہب کا ابتدائی رول بہت اہمیت کا حامل ہے۔ البتہ نبوت کے خاتمے اور انسانی بصیرت پر اعتماد کے بعد گویا مذہبیت کا ایک مقصد مکمل ہو گیا ہے۔

۲۔ عقلیت انسانی صفت ہے جو اس کا جوہری امتیاز ہے اور جس کی بنا پر انسان ''انسان'' ہے۔ مذہبیت اور عقلیت کا ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہیں۔

۳۔ تجربیت حواس انسانی پر مدار کرتی ہے۔ تسخیر کائنات کی خاطر نہ دیکھی جانے والی دنیا سے کنارہ کش ہو کر صرف آنکھوں سے دیکھی جانے والی دنیا کی کھوج میں شامل ہونا ہے۔

۴۔ وجدانیت بھی انسانی اوصاف میں سے ہے۔ عقلیت و تجربیت سے اوپر اٹھنا وجدانیت کہلاتا ہے۔

۵۔ تخلیقیت، بیسویں و اکیسویں صدی میں انسان کے ہاتھوں خدائی طرز کی ایجاد کے دور کی نمائندگی کرتی ہے۔

علم سیرت کی نمود کے تسلسل کو ہم آٹھ جہات و مدارج کے تحت بیان کر کے مقالے کے اختتام کی طرف جائیں گے اور یہی اس تحریر کا خلاصہ اور نتیجہ بنتا ہے:

علم سیرت کی پہلی نمود

''قیادت'' وہ پہلی نمود ہے جس کی سیرت ہمارے لیے اسوہ و نمونہ بنی۔ یہ ذات محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے جس کا انتخاب قدرت نے کیا۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۱)

اے محمد! ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا۔

علم سیرت کی دوسری نمود

''غایت'' وہ دوسری نمود ہے جس سے ''سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' عمل محمد صلی اللہ

۱۔ الانبیاء: ۱۰۷

علیہ وسلم سے گزر کر ہمارے لیے اسوہ نمونہ بنی۔ یہ وحی ہے جسے قرآن کی صورت میں جامع کر دیا گیا اور مستقل ہدایت کے طور پر محفوظ کر دیا گیا۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (۱)

بے شک یہ تمام جہانوں کے لیے راہ عمل ہے۔

علم سیرت کی تیسری نمود

''قیادت'' غایت کے تحت ''قیادت'' بنی۔ نظام نبوت کی آخری قیادت، تکمیل دین کا آخری نمونہ، سیرت کا اسوہ، ذات محمد صلی اللہ علیہ سلم کا روز نامچہ جو شخصی، اجتماعی، قومی اور آفاقی زندگی کے لیے مشعل راہ ہے۔

كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۲)

بے شک ہم نے تمہارے لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں بہترین نمونہ رکھا ہے۔

علم سیرت کی چوتھی نمود

سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عمل گاہ نائب حق ''شخصیت سازی'' ہے۔ پیغمبرانہ قیادت کے فوری اثرات کا پہلا مرحلہ حجۃ الوداع ہے۔ جسی ہم نے ''غایت'' اور ''قیادت'' کے تحت اٹھانے کا عزم کیا ہے۔ نوری اثرات بعد ازاں کم وبیش حضرت نائب میں سموتے چلے گئے۔ یہ سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کے تجربات ہیں۔

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (۳)

اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے (تمہاری آرا سے) حکم ران بنایا گیا۔

۱۔ یوسف: ۱۰۴

۲۔ الاحزاب: ۲۱

۳۔ النساء: ۵۹

علم سیرت کی پانچویں نمود

سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ''علمیات'' میں روانی لیتی پندرہویں اکیسویں صدی میں داخل ہوچکی ہے۔ ''غایت'' اور ''قیادت'' کی روانی کا یہ علمی پہلو ہے۔ اس کی تلاش وتعین کی ضرورت امت کو ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ، وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۔ (۱)

وہ جسے چاہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا ہوگئی اسے بہت بڑا خزانہ علم مل گیا۔

علم سیرت کی چھٹی نمود

سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم روحانیت میں روانی لیتی پندرہویں/ اکیسویں صدی میں داخل ہوچکی ہے۔ ''غایت'' اور ''قیادت'' کا یہ ''روحانی'' پہلو ہے۔ اس پہلو سے ''فیضان محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' کی تلاش آج بھی ممکن ہے اور سیرت کا یہ تازہ امتیازی پہلو شمار ہوگا۔

''حکمت'' روحانی فیضان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر انسان میں مکمل نہیں ہوتی ہے۔ (۲)

علم سیرت کی ساتویں نمود

پندرہویں/ اکیسویں صدی میں انسان بہت تیزی سے ''علمیات'' کے مدارج عبور کر رہا ہے اور لگتا ہے کہ وہ ''شعوریت'' (۳) کے مابعد الطبعی میدان میں داخل ہوا چاہتا ہے جہاں

۱۔ البقرہ: ۲۶۹

۲۔ ایضاً

۳۔ ''شعوریت'' میرے نزدیک آنے والا نیا مقولہ تحقیق وعلم ہے۔ جہاں مادی سائنس اپنے نظریات ولوازمات کے ساتھ داخل ہو رہی ہے اور طبعیات اور مابعد الطبعیات کی تطبیق کا میدان سمجھنے والا ہے اور جہاں مذہب کو فائدہ ہوگا اور مادیت کو نقصان نہیں ہوگا۔ اسے راقم الحروف نے اپنی زیر طبع کتاب ''شعور نبوت اور اکیسویں صدی'' میں زیر بحث لیا ہے۔

مذہب و مادے کا ملاپ واتحاد ہونے جارہا ہے۔ ''غایت'' اور ''قیادت'' کی سیرت کے ساتھ ''فیضان محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' اس ملاپ و تطبیق میں مؤثر ترین رہبر ہوں گے۔

فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿۵۶﴾ (۱)

خدا کی جماعت ہی غلبہ پانے والی ہے۔

یہی حیات مآخذات ''علوم سیرۃ'' ہیں لیکن جہات پر عمل پہلے درکار ہے۔ مسئلہ علم کا نہیں، غایت کے حصول کا ہے۔ غایت کے حصول کا ذریعہ پندرہویں/ اکیسویں صدی میں ''قیادت'' کی نئی سرے سے دریافت ہے اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کم از کم امت میں کوئی اور نہیں ہوسکتی ہے۔ ''غایت'' اور ''قیادت'' کو ہم دور رسالت سے اٹھا کر تعین کر لیتے ہیں تو پھر ''علمیات'' اور ''فیضان محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' پر ساری توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ ''غایت'' اور ''قیادت'' کی بنیاد پر ''علمیات'' میں اثبات، نفی اور تطبیق سے گزرنا ہے اور نبی رحمت، نور وحی، نور الٰہی، نور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی لے کر ان کی قیادت (والقائد الی الخیر) میں غایت (الداعی الی الرشد) کو پانا ہے ''فیضان محمد صلی اللہ علیہ وسلم'' کا یہی راستہ ہے۔

۱۔ المائدہ: ۵۶